Kashf Journal of Multidisciplinary Research
Vol: 02 - Issue 11 (2025)
P-ISSN: 3007-1992 E-ISSN: 3007-200X
https://kjmr.com.pk

دھنک کا آٹھواں رنگ: عورت کے بدن پر تحریر کردہ ظلم کی داستان ایک مطالعہ

The Eighth Colour of the Rainbow: A Study of the Tale of Oppression Inscribed on the Female Body

***Dr.Rifat Choudhry*[1], Saira Sajjad[2]**
[1] Lecturer, Department of Urdu, GC Woman University, Sialkot.
[2] Scholar, GC Women University, Sialkot

Abstract

This article explores the themes of gender and social issues as presented in Leena Hashir's book "Dhanak ka Aathwan Rang", which is a collection of thought-provoking columns. It analyzes the ways in which the author addresses the challenges faced by women and marginalized communities, highlighting cultural biases, societal norms, and systemic inequities. By examining specific examples from the columns, the article emphasizes the need for awareness, empathy, and social reform to promote justice, dignity, and equality. The study underscores how literature and journalistic writing can serve as powerful tools for reflecting on and challenging entrenched gender norms.

Article Info

This article is an open access article distributed under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC BY) license https://creativecommons.org/licenses/by/4.0

Keywords: *Gender discrimination, violence, gang rape, sexual abuse, divorce, religious hatred, and murder/atrocities*

عورتوں پر ظلم و ستم کی داستان بہت قدیم ہے۔ دنیا کی تاریخ جب بھی رقم کی جاتی ہے اس صفحہ قرطاس کے حاشیے پر عورتوں کے آنسو بدنما دھبوں کی صورت ثبت ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی آمد سے قبل برصغیر کی فضا جہالت، تعصّب اور سفّاک رسم و رواج سے آلودہ تھی۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ دین اسلام نے عورت کو عزت، وقار اور اس کے جائز حقوق سے روشناس کرایا اور جہالت کے اندھیروں کا خاتمہ کر دیا۔ مگر المیہ یہ ہے کہ آج کے دور میں بھی، اسلام کی حقیقی تعلیمات سے کوسوں دور، کچھ درندہ صفت انسان موجود ہیں جو عورت کو کمزور سمجھ کر اس کے حقوق سلب کرتے اور اس کی عصمت و حرمت کو پامال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

لینہ حاشر عصرِ حاضر کی ایک نمایاں اردو قلم کار ہیں جو کالم نگاری، افسانہ نویسی، شارٹ فلم اور بلاگ (تحریر) کے میدان میں سرگرم ہیں۔ ان کی پیدائش ایک ادبی گھرانے میں ہوئی۔ وہ معروف شاعر انور مسعود کی بیٹی اور حاشر ابن ارشاد کی بیوی ہیں۔ ان کی تحریریں مختلف آن لائن ادبی پلیٹ فارمز پر شائع ہوتی رہی ہیں جہاں وہ اپنے منفرد اور ادبی اسلوب کے ذریعے قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ انہوں نے آن لائن پلیٹ فارم "ہم سب" اور "روزنامہ دنیا" پر لکھ کر ادبی پہچان قائم کی۔ انہوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو فکری اور معنوی سطح پر پیش کر کے سماجی بیداری کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے معاشرے کے الم ناک پہلوؤں کو اپنے کالمز کے ذریعے منظر عام پر لایا۔

کتاب **"دھنک کا آٹھواں رنگ"** ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں کل ۵۱ کالم موجود ہیں۔ انھیں کالم بھی کہا جا سکتا ہے اور افسانچے بھی۔ ان کالموں میں زندگی کی رنگارنگی بھی موجود ہے اور افسردگی بھی لیکن زندگی کے تلخ حقائق زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ انور مسعود کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ لینہ کے قلم کو بڑی دردمندی عطا ہوئی ہے۔ اللہ تعالی نے اسے ایک حساس دل سے نوازا ہے۔ محروم، مجبور اور مظلوم انسانوں کے لیے وہ ایک سلگتی ہوئی ہمدردی ہے۔ اس کی تحریروں میں افسردگی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔ نوحہ غم بھی۔ نغمۂ شادی بھی۔ لیکن افسردگی کا پلہ بھاری ہے۔ شائستگی بھی بیشتر شدید طنز کا پیرایا لیے ہوئے ہے۔

لینہ حاشر کی کتاب " دھنک کا آٹھواں رنگ " مختلف رنگوں سے مزین ہے۔ اس کتاب میں جہاں زندگی کے خوبصورت رنگ جگمگاتے ہیں وہاں معاشرے کے کرب ناک مناظر بھی سامنے آتے ہیں۔ مصنفہ اپنے عمیق تجربے کے باعث خواتین پر ہونے والے ظلم و ستم کی ایسی داستانیں رقم کرتی ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں۔

ڈاکٹر حنا جمشید جو گورنمنٹ گریجویٹ کالج ساہیوال میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں وہ لینہ حاشر کی کتاب سے متعلق کہتی ہیں کہ

"لینہ نے جب جب یہ تحاریر لکھی ہوں گی، میں یہ سوچتی ہوں کہ انہوں نے اس درد کو اپنے اوپر طاری کیا ہوگا، وہ اس کرب سے اس تکلیف سے خود گزری ہوں گی، انہوں نے وہ سب کچھ اپنی ذات پر محسوس کیا ہوگا جو ہر اس فرد کے ساتھ گزرا، کسی بھی حادثے یا سانحے کا جس نے سامنا کیا۔"(۱)

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالی ہے۔

"آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے۔ یا وہ انھیں ملا کر دیتا ہے بیٹے اور بیٹیاں اور جس کو چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"(۲)

اس آیت کا بنیادی مقصد یہ بتانا ہے کہ تخلیق کا اختیار مکمل طور پر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انسانی عقل اس کے فیصلوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ انسان کی پیدائش مختلف صورتوں میں ہو سکتی ہے اور ہر صورت اللہ کی مشیت کا حصہ ہے۔ اس لیے جو لوگ پیدائشی طور پر عام جسمانی تقسیم سے مختلف ہوں، وہ بھی اللہ کی تخلیق ہیں، کسی نقص یا عیب کا نتیجہ نہیں۔ اسلام میں خواجہ سراؤں کو گناہ گار نہیں کہا گیا اگر وہ فطری طور پر ایسے ہوں جیسے خدا نے تخلیق کیے ہیں۔ احادیث میں مذمت اُن لوگوں کی ہے جو جان بوجھ کر مخالف جنس کی نقالی کرتے ہیں۔

کالم **"مرنے کے بعد خواجہ سرا کا اپنی ماں کو خط"** دراصل خط کی صورت میں موجود ہے۔ اس میں مصنفہ خواجہ سرا کی زبانی ظلم و ستم کی داستان سناتی ہیں جس کے ساتھ اس کے باپ نے معاشرے کے لوگوں کے طعن و تشنیع کے باعث قہر آلود رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ اس کالم میں والد کی درشتی اور نو دس برس کے بچے کی پامالی کا ذکر موجود ہے۔ یہ کالم مخنثوں کے مسائل کو اجاگر کرتا ہے جو بے قصور ہونے کے باوجود ذہنی اور جسمانی تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کا وجود معاشرے میں گالی سمجھا جاتا ہے۔ مصنفہ نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلم کی طاقت سے مخنثوں کے حقوق کی آواز اٹھائی۔ انھوں نے ان کے متعلق لوگوں میں شعور کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس کالم میں ایک ماں کے دکھ کو عیاں کیا گیا ہے جو عبودیت کی زندگی گزارتے ہوئے اپنے بچے کے حقوق کے لیے آواز نہیں اٹھا پاتی اور شوہر کے جلال کے سامنے بے بس ہو کر اپنے ہی بچے کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھتی ہیں۔ مصنفہ نے کالم میں یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ اس ماں کی آہ و فغاں اور سسکیوں کی وجہ وہ شریف لوگ ہیں جو مخنثوں سے جینے کا حق چھین لیتے ہیں ان پر انگلیاں اٹھاتے اور انھیں اپنی ماں سے جدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں خواجہ سرا اپنی والدہ کو خط میں لکھتا ہے کہ

"پٹائی کا دن جب رات میں ڈھلتا تو تم ابا سے چھپ کر دبے پاؤں آتیں، مجھے سینے سے لگاتیں، اپنے دوپٹے سے میرے زخموں کی ٹکور کرتیں۔۔۔۔ صبح ہوتی اور تم پھر اس عورت کا لبادہ اوڑھ لیتیں جو ابا اور معاشرے کے خوف سے مجھے پیار کرتے ڈرتی تھی۔"(۳)

کالم میں اس عورت پر ہونے والے ظلم و ستم کی روداد موجود ہے جس کی ممتا کو لوگ پیروں تلے روند کر خود کو شرفاء میں شمار کرتے ہیں۔ ایسے شرفاؤں کی شرافت سے پردہ ہٹا کر مصنفہ نے ان کے ذہنوں کی غلاظت کو سامنے لایا ہے جو شرافت کی آڑ میں ہنستے مسکراتے گھر کو آگ لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ کالم میں خواجہ سراؤں کی بے بسی کا ذکر بھی ملتا ہے جن کے گھروں سے نکالے جانے کے بعد آبروریزی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان کی عزت تار تار کر دی جاتی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی اپنے حق کے لیے آواز اٹھا لے تو انھیں موقع پر ہی قتل کر دیا جاتا ہے۔

عدنان خان کاکڑ اس کالم کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ یہ کہانی پڑھ کر سوچ کا یہ پہلو سامنے آیا ہے کہ چوک پر کھڑے ہو کر بھیک مانگنے سے کم از کم یہ مظلوم خواجہ سرا، پیٹ بھرنے کے لیے جسم فروشی کے عذاب سے بچ جاتے ہیں۔ کاش یہ کہانی ہمارے میٹرک کے نصاب میں شامل کی جائے تاکہ ہمارے بچے مظلوموں سے ہمدردی کرنا سیکھیں اور ان کے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کریں۔

نیلم احمد بشیر "کتاب دھنک کا آٹھواں رنگ" کے دیباچے میں لکھتی ہیں کہ لینہ نے ایک ایسے بچے کی کہانی بیان کی ہے جو بچپن سے ہی اپنے باپ کا ظلم، جبر اور عتاب سہتا رہا اور پھر ایک روز اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ ایسے گھروں میں مائیں بھی اکثر بے بس اور بے اختیار ہوتی ہیں کیونکہ وہ اپنے شوہروں کے رحم و کرم پہ ہوتی ہیں، اس لیے وہ اپنے بچے کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں اور بس اس کی جدائی کا زہریلا غم سہتی سہتی سب سہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ وہ بچہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے، اسے ہوس کے مارے ہوئے مردوں کے نچلے دھڑوں میں اُبلتے ہوئے گٹروں کے غلیظ پانی کے اُبال کو ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی وہ جنونی افراد کی بے رحم گولی کا نشانہ بھی بن جاتا ہے۔ پھر اگر خواجہ سرا ہسپتال تک پہنچ بھی جائیں تو ہسپتال والے انھیں زنانہ یا مردانہ وارڈز کے برآمدوں میں دھکیلتے دھکیلتے موت کے دہانے تک پہنچا دیتے ہیں۔

کالم **"خواجہ سرا کا خط، تلافی کا پہلا قدم"** میں مصنفہ خود کو خواجہ سرا علیشاہ کے قتل پر سرزنش کرتی ہیں کہ ہم جیسے لوگوں کی چبھتی نظروں کی وجہ سے ہی ایسے بچوں کو نفرت اور حقارت جھیلنے کو ملتی ہے۔ وہ معاشرے کے لوگوں پر طنز بھی کرتی ہیں جہاں بے حسی عروج پر ہے۔ جنسی زیادتی سے انکار کی صورت میں انہیں قتل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ خواجہ سرا اپنی جنس کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے ہسپتالوں کے مردانہ اور زنانہ وارڈ میں دھکے کھاتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

علی اکبر ڈان ای۔ پیپر میں لکھتے ہیں کہ

"PESHAWAR: Transgender female Alisha who was shot eight times earlier this week….."Alisha died in LRH because she never received intensive medical attention..." (۴)

اسی طرح کالم **"سسکیوں کی گونج میں زندگی مسکرائی ہے"** میں خواجہ سراؤں کے لیے احتشام انور کا نام اہمیت کا حامل ہے جو ڈپٹی کمشنر بہاولپور ہیں۔ انھوں نے کالم "مرنے کے بعد خواجہ سرا کا اپنی ماں کو خط" پڑھنے کے بعد ملتان میں ان بچوں کے لیے سکول کھولا جن کی جنس کا تعین نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان کے حقوق کے متعلق ملکی سطح پر سوچا گیا۔ اس حوالے سے لینہ حاشر کالم سماجی شعور کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔

کالم **"گول روٹی"** کی بات کی جائے تو اس میں معاشرے کی حقیقی کہانی بیان کی گئی ہے جو قاری کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ دیکھا جائے تو باپ بیٹی کی عزت کا محافظ ہے۔ وہ اپنی بیٹی پر کوئی آنچ نہیں آنے نہیں دیتا لیکن اس کالم میں مصنفہ نے معاشرے کے اس درندہ نما سنگدل باپ کی عکاسی کی ہے جو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی بیٹی کا قتل کرتا ہے۔ کالم میں انیقہ خالد کے والد کی درندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انیقہ کوئی افسانوی کردار نہیں بلکہ ایک حقیقی کردار ہے۔

یکم اکتوبر ۲۰۱۵ء کو ایکسپریس ٹری بیون نے ایک سچا واقعہ شائع کیا اس کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"The 12-year-old girl found dead outside Mayo Hospital in Lahore was killed and dumped by (۵)her father and brother for 'not making gol roti', police said on Wednesday."

یہ لاہور کا سچا واقعہ ہے۔ ستمبر ۲۰۱۵ء میں انیقہ خالد کو اس کے والد اور بھائی نے مل کر قتل کیا کیوں کہ وہ گول روٹی نہیں بنا پائی تھی۔ اصل واقعے میں یہ بتایا گیا کہ اس کے والد نے سب سے پہلے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی۔ اس کے بعد اغوا اور قتل کا کیس فائل کرایا تھا۔ اس بچی کی لاش انار کلی ایریا سے بازیافت ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ خبر بھی سامنے آئی کہ انیقہ کا والد اپنی بیوی پر بہت تشدد کیا کرتا تھا۔

اصل واقعے کی نسبت اگر کالم میں دیکھا جائے تو لینہ حاشر نے جذبات و احساسات کے ساتھ کہانی کو بیان کیا۔ لینہ حاشر کے کالم میں بھائی کا ذکر کہیں موجود نہیں۔ انھوں نے صرف باپ کے تشدد کو موضوع کالم بنایا۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"باپ تو اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت دنیا جہان کی دولت اس پر نچھاور کرتے ہیں۔۔۔ آپ نے بابا میری لاش کو بے کفن، بے یارو مددگار مردہ خانے کے باہر چھوڑ دیا۔ میں لاوارث نہیں تھی، میں آپ کی سگی بیٹی تھی۔"(۶)

مصنفہ نے انیقہ خالد کی زبانی خط کے ذریعے اس آپ بیتی کو بیان کیا جو بیچاری ۱۲ سالہ بچی پر گزری تھی۔ جس پر ڈنڈوں کی برسات کی گئی اور اس کے دماغ کو مفلوج کر کے رکھ دیا گیا۔ ایسا خط جو قتل کے بعد جنت سے اپنے باپ کو لکھا گیا۔ جس میں مصنفہ نے انیقہ کے ساتھ ہوئے ظلم کی داستان اور قتل کیے جانے کے بعد اپنے باپ کی محبت کو انیقہ ہی کی زبانی بیان کیا گیا۔ معاشرے میں دیکھا جائے تو مرد خود کو حاکم سمجھتا ہے اور عورت کو محکوم۔ اور جب چاہتا ہے عورت کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کی نظر میں عورت صرف اس کی غلام ہے۔ اسی صنفی امتیازات کے پیمانے میں مرد اور عورت کو تول کر مرد کی تربیت کی جاتی ہے کہ مرد برتر ہے اور عورت کم تر۔ یہ سوچ صرف ایک شخص تک محدود نہیں رہتی بلکہ نسلوں تک منتقل ہوتی ہے تاکہ مردانہ تسلط برقرار رہے اور عورت ظلم کی چکی میں پستی رہے۔ خالد نے یہی سوچ اپنے بیٹے میں بھی منتقل کی اور دونوں نے مل کر پھول جیسی کلی کو اپنی سفاکیت کی بھینٹ چڑھا دیا۔

مصنفہ نے اپنے کالم میں ایک بچی کے ساتھ ہونے والی ظلم کی داستان کو دردمندی کی روشنائی میں ڈبو کر صفحہ قرطاس پر اس انداز سے رقم کیا کہ پڑھتے ہوئے قاری کے آنسو موتیوں کی لڑی کی طرح اس کی آنکھوں سے گرنے لگتے ہیں گویا شبنم کے قطرے ہوں اور تواتر سے بہہ رہے ہوں۔ مصنفہ نے حقیقی واقعے کو تخیلاتی خط کی صورت میں سمو کر ظلم کی داستان بیان کی۔ اس گول روٹی پر ان کے بیٹے عمر صمام نے فلم بھی بنائی جس پر اسے ایوارڈ بھی ملا۔

کالم **"حرام خور اور اس کی بیٹیاں"** میں حقیقی تانیثی مسائل کو سامنے لایا گیا ہے۔

اسلام میں بیٹوں کو نعمت اور بیٹیوں کو رحمت کہا گیا ہے اور اپنی بیوی اور بیٹیوں سے حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ معاشرے کے ظالم و جاہل لوگ بیٹی کی پیدائش پر افسردہ ہو جاتے ہیں۔

سورۃ نحل کی آیت ۵۸ کا ترجمہ ہے۔

"اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے بھر جاتا ہے۔"(۷)

قرآن مجید میں صاف واضح کیا گیا ہے کہ بیٹی کی پیدائش پر غم کھانا جاہلیت ہے۔ یہ کافروں کا عمل ہے مومنین کا نہیں۔ آج کے دور میں بیٹی کی پیدائش پر سوگ منایا جاتا ہے۔ بیٹی پیدا کرنا اس عورت کے لیے آزمائش بن جاتا ہے جس کے ہاں بیٹی ہوئی۔ اس غلطی کی پاداش میں اس عورت پر تشدد کیا جاتا ہے۔ قدرت کے فیصلے کے سامنے انسان بے بس ہے تو پھر وہ عورت کیسے گنہگار ہوئی جس کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے؟ مصنفہ نے اس کالم کے ذریعے معاشرے کی سفاکی کو موضوع بنایا ہے جہاں عورت پر ہاتھ اٹھانا اور اس کو بیٹیوں کے طعنے دینا معمول بن گیا ہے۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"بیٹیاں پیدا کرنے کی سزا کے طور پر اکثر محسن اس کے بال نوچتے ہوئے طلاق کی دھمکی دیتا۔"(۸)

معاشرے میں پیروں فقیروں پر اندھا اعتماد کیا جاتا ہے۔ ان کے سامنے بیویوں کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ دم درود کروا لیا جائے اور بیٹا پیدا ہو جائے۔ مصنفہ نے معاشرے کے ان جعلی پیروں پر کڑی تنقید کی گئی ہے جو پیری مریدی کا جھوٹا لبادہ اوڑھے اپنے غلیظ فعل سرانجام دیتے ہیں۔ عورتوں کے جسموں کو چھونے کی گھٹیا کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ہوس کے پجاری پیر اور ان پر ایمان کی حد تک پختہ یقین رکھنے والے مرید دین اسلام سے خارج ہیں۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"نجانے کتنے پیر اس کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتے۔ سخت تناؤ میں آنے کے بعد جب وہ کسی کے آگے جانے سے انکار کرنے کی جرات کرتی تو پھر اس کی تھپڑوں اور جوتوں سے عزت افزائی کی جاتی۔"(۹)

حرام خور کو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں مار پیٹ کا نشانہ بنایا جاتا۔ اسے پیروں فقیروں کے سامنے پیش کیا جاتا۔ جب اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔

کالم "**دو گھونٹ پانی**" میں مرکزی کردار دل نگار کی کہانی بیان کر کے مصنفہ نے سماج کے درندوں پر کڑی تنقید کی ہے جو جنگوں کی آڑ میں معصوم کلیوں کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ عورت کو گوشت کا ایک لوتھڑا سمجھتے ہیں اس کی طرف ایسے لپکتے ہیں جیسے صدیوں سے بھوکا رال ٹپکاتا کتا اپنے شکار کو دیکھ کر للچائے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس افسانچے یا کالم کے ذریعے پندرہ سولہ سال کی خوبصورت لڑکی کی زندگی جہنم کر دینے والی داستان بیان کی گئی ہے جو مسلسل چھ مہینے گینگ ریپ کا شکار رہی۔

اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"جب اس نے لمبے کالے بوٹ پہنے شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ پھر دل نگار کے جسم کی معصومیت کو اس نے اپنے اندر کی حیوانیت سے روند ڈالا۔ ابھی وہ اپنی بے بسی اور تکلیف پر دھاڑیں مار مار کر رو بھی نہ پائی تھی کہ ایک کے بعد ایک اور درندہ اس کے پھول جیسے جسم کو مسلتا چلا گیا۔"(١٠)

اس بے حسی کے دور میں انسان ہی انسان کا دشمن بنا بیٹھا ہے۔ بے حسی عروج پر ہے۔ کالم میں دھماکے اور اس کے نتیجے میں کٹی پھٹی لاشوں اور افراتفری میں ادھر ادھر بھاگتے لوگوں کی تصویر، بے دردی سے قتل عام کرنے والے حیوان نما انسانوں کی سفاکیت کو سامنے لاتی ہے۔ اس افراتفری میں معصوم لڑکیوں کو اغوا کر کے گینگ ریپ کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہوس کے پجاری اپنی ہوس کی آڑ میں معصوم کلیوں کو پھول بننے سے پہلے ہی روند کر عیاشیاں کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کے گھٹیا ترین انسان ہیں بلکہ انسان کہلانے کے لائق نہیں۔

ایسی صورتحال میں جب ایک لڑکی کو چھ مہینے مسلسل استحصال کا نشانہ بنایا جائے تو اس لڑکی کا دماغ مفلوج ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ ایسی صورتحال میں دل نگار گھر آنے کے بعد خودکشی کر لیتی ہے۔ دل نگار نے نیند کی گولیاں دو گھونٹ پانی سے کھا کر خودکشی کی۔

اقتباس دیکھیے۔

"اگلی صبح شیشی اور گلاس خالی ملے۔ دل نگار کی لاش ٹھنڈے فرش پر پڑی تھی۔۔"(١١)

نیلم احمد بشیر دھنک کا آٹھواں رنگ کے دیباچے میں لکھتی ہیں کہ لینہ سنجیدہ موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں تو دل کے ہزار ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ وہ معاشرے کے ایسے گھناؤنے اور ظالمانہ رویوں کی کہانی کہتی ہیں کہ دل لرز کے رہ جاتا ہے اور سوچ بدلنے لگتی ہے۔

کالم **"صندوقچی میں رکھے دکھ سکھ"** کی بات کی جائے تو اس کالم میں مذہب اور دھرم کے نام پر فسادات کا ذکر ملتا ہے جس میں نہ صرف جھگڑوں کی فضا قائم ہوتی ہے بلکہ جانی و مالی نقصان بھی ہوتا ہے۔ اس کالم کا مرکزی کردار کپیل (ہندو) ہے۔ وہ ان دنگے فسادات میں رضاکارانہ طور پر لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ اس کا سارا گھر مذہبی فسادات کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ ماتا، پتا اور گھر سب آگ میں جل کر راکھ بن جاتے ہیں۔ اسی انتقامی آگ میں وہ اپنی منہ بولی بہن (سکھ) کا جنسی استحصال کرتا ہے۔ صندوقچی میں رکھے دکھ سکھ کا مطلب ہی ایک طرف منہ بولی بہن کی پہنائی راکھی، اس کی چنری دوسری طرف اس کے کٹے بال، ٹوٹی چوڑیاں، اور مٹی سے اٹی چپل تھی۔

اس کہانی کو لکھ کر مصنفہ نے معاشرے کی حقیقت کو عیاں کیا ہے جہاں لوگ مذہب کو بنیاد بنا کر لوگوں کے گھروں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتے ہیں۔ مذہب کے نام پر سیاست عروج پر ہوتی ہے۔ جہاں پہلے مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے تھے وہاں ایک دوسرے کے مخالف کھڑے نظر آتے ہیں۔ مذہب کو اپنے

مفادات کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔لوگوں کے سامنے پر تاثیر تقاریر کی جاتی ہیں تاکہ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کیا جائے۔اس لوٹ مار میں عورتوں کا استحصال بھی کیا جاتا ہے۔

اقتباس دیکھیے:

"دنگے فسادات گلی محلوں تک آن پہنچے تھے۔نفرتوں کی آگ سے لوگوں کے گھر جل رہے تھے۔۔۔لوٹ مار، جلاؤ گھیراؤ کے ساتھ ساتھ عورتوں کی چیخوں پر نہ زمین لرزتی تھی نہ آسمان پھٹتا تھا۔"(۱۲)

انتقامی کاروائی میں حصہ لینا معاشرے میں معمول کی بات ہے۔اسی انتقام کی آگ میں جل کر کرپیل نے منہ بولی بہن جیسے مقدس رشتے کا مان نہ رکھا اور اس معصوم سکھ لڑکی کی عزت تار تار کر دی۔اس واقعے کے بعد کرپیل کی نفسیاتی کیفیت خراب ہو جاتی ہے۔

وہ خوفناک منظر ملاحظہ کریں جس میں ایک منہ بولی بہن کی اپنے بھائی سے التجا ہے کہ مقدس رشتے کا مان رکھا جائے اور اس کا دامن داغدار نہ کیا جائے اقتباس دیکھیے۔

"قمیض کے چیتھڑوں میں سے نہ کر ویرا، نہ کر کرپیل ویرا اوے، تینوں رب دی سوں مینوں چھڈ دے ویرا کی نہ رکنے والی آوازیں اور ان سب پر جبی انتقام کے شعلوں سے جنم لینے والی ایک نہ ختم ہونے والے دکھ کی راکھ۔"(۱۳)

کالم طوبٰی کے بارے میں کیا سوچا؟ میں مصنفہ نے معاشرے کی بے حسی کو منظر عام پر لایا ہے۔معاشرے کے لوگ جب ٹی وی پر کوئی خبر سنتے ہیں جس میں کسی بچی کا جنسی استحصال کیا گیا تو اس پر تھوڑی دیر کے لیے افسوس کرتے ہیں لیکن بعد میں سب اس واقعے کو بھول کر اپنے اپنے کاموں میں مگن ہو جاتے ہیں۔انھیں اس بات کی تسلی ہوتی ہے کہ ان کی اپنی بیٹیاں محفوظ ہیں۔کوئی بھی کسی کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے آواز نہیں اٹھاتا۔کالم میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ عوام کو احتجاج کرنے کی ضرورت ہے۔کسی سیاسی پارٹی کے لیے سڑکوں پر نکل کر احتجاج کرنے کی بجائے ایسی معصوم بچیوں کے انصاف کے لیے آواز بلند کرنا نہایت ضروری ہے۔کالم میں ان جذباتی احساسات کا اظہار دردمندانہ الفاظ سے کیا گیا ہے جو قاری کو جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"آپ کیا سمجھتے ہیں کہ طوبٰی کا قصوروار صرف وہ شخص ہے جس نے اس کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کھیلا؟ نہیں، غلط۔ہم سب اس واقعے کے بعد لبوں پر یہ جو خاموشی سجائے بیٹھے ہیں اس ظلم میں شریک ہیں۔"(۱۴)

مصنفہ نے نثر میں سادگی اور سہل ممتنع سے کام لیا ہے۔لینہ حاشر کے نثر میں سادگی اور متانت ہے۔انھوں نے مشکل الفاظ کا استعمال کرنے سے گریز کیا ہے۔کالم کی مرکزی کردار مصنفہ ہیں جو طوبٰی (چھ سال کی بچی) کی کہانی سناتی ہیں جو گینگ ریپ کا شکار ہوئی۔مصنفہ عوام پر طنز کے تیر چلاتی ہوئیں ان کو باور کراتی ہیں کہ اس حادثے کے بعد اس ننھی بچی کے لیے انصاف کی آواز اٹھانا عوام کی ذمہ داری تھی جس سے انہوں نے روگردانی کی۔

کالم میں ان معصوم بچیوں کو جن کا بچپن چھین کر ان کے جسم پر ظلم کی داستان رقم کر دی جاتی ہے۔ مصنفہ معاشرے کے ان کریہہ اور گھٹیا چہروں کو نہ صرف سامنے لاتی ہیں بلکہ انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے متعلق قارئین کو آگاہی بھی فراہم کرتی ہیں۔ اس کالم کا اہم مقصد یہ ہے کہ ایسے درندوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ ان درندوں کا انجام دیکھ کر باقی درندوں پر ایسا خوف طاری ہو اکہ وہ دوسروں کی بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلنے سے پہلے سو دفعہ سوچیں۔ ایک بچی جو کھلونوں سے کھیلتی ہو اس کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنا کر کوڑے میں پھینک دینا انسانیت، اخلاق اور ضمیر تینوں کی موت ہے۔

کالم "**پیلے ہاتھ اور نیلے ہونٹ**" میں فاطمہ نامی لڑکی کو چار خواتین کے ساتھ گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ لینہ حاشر دردناک واقعے کو محسوس کر کے اپنی تحریر کا حصہ بناتی ہیں۔

لینہ حاشر ٹویٹر کے ذریعے مصنفین کی کانفرنس میں کہتی ہیں کہ:

"مجھے یاد ہے کہ کوئٹہ میں لاشیں رکھی ہوئی تھیں انھوں نے سڑکوں پہ۔ جب تک میں نے خود کو وہاں پر محسوس نہیں کر لیا کہ میں وہاں ہوں تب تک میں نے نہیں لکھا تھا۔ وہاں کی ٹھنڈ تک کو میں نے محسوس کیا تھا اپنے آپ میں۔ تب لکھا تھا میں نے۔"(۱۵)

اس حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ فاطمہ کو گولی کا نشانہ کیوں بنایا؟ آخر حملہ اوروں کی فاطمہ یا دوسری خواتین سے کیا دشمنی تھی؟ اس بات کا کالم میں ذکر نہیں ملتا۔ اس واقعے کی بنیادی وجہ فرقہ وارانہ تعصب ہے۔ کوئٹہ میں ہزارہ برادری نسلی تعصب اور شیعہ مسلک تعصب کا نشانہ بنتی ہے۔ ایسے حملوں کے پیچھے کالعدم تنظیمیں ہوتی ہیں جو مذہب کے نام پر نفرت پھیلاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ملک میں عدم استحکام کی کیفیت جنم لیتی ہے۔

ڈان ای پیپر میں ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۶ء کو پبلش ہونے والے کالم میں سید علی شاہ ایسے واقعات سے متعلق اعدادی شماریات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"Balochistan has been experiencing incident violence and targeted killings since more than a decade. More than 1,400 incidents targeting the minority Shia and Hazara community have (۱۶)taken place in the province during the past 15 years."

کالم کا عنوان "پیلے ہاتھ اور نیلے ہونٹ" تشبیہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہر ماں اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے اور اسے لال جوڑا پہنانے کا ارمان دل میں سجائے ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر اس کی بیٹی قتل کی بھینٹ چڑھ جائے تو پیلے ہاتھ اور نیلے ہونٹ قتل کے بعد اور جسم سے نچڑتا ہوا لال دلہن کا لباس بن جاتا ہے جس کو رخصت کر دیا جائے تو کبھی اس کا چہرہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک ماں کے کرب کی داستان فاطمہ نامی لڑکی کی زبانی مصنفہ نے سہل انداز سے پیش کی گئی ہے۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"جوں جوں میرا جوڑا سرخ ہو رہا تھا، توں توں میرے ہاتھوں کا رنگ بھی پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ لگا جیسے تمہارا سپنا حقیقت میں ڈھل رہا ہے، پر تم نجانے کیوں اس لال جوڑے اور ہاتھوں کی اس پیلاہٹ کو دیکھ کر غش کھا گئیں۔"(۱۷)

"ڈھولک کی تھاپ پر بین کرتی آوازیں" کالم میں خون خرابہ، قتل و غارت اور جنگ کا ذکر ہے۔ وادی نیلم کے قریب بارڈر ہے جو پاکستان اور ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ وہاں پر فائرنگ اور دفاعی کاروائیوں کی وجہ سے دونوں ملکوں کا نقصان ہوتا ہے اور وہاں قتل و غارت کی فضا پھیل جاتی ہے۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"یہ نیلم کی وادی بھی عجیب جگہ ہے۔ یہاں تالیوں کی گونج کا ملاپ ہوتا ہے، قہقہے ہنسی سے ملنے آتے ہیں، کھانوں کی خوشبو دریا کے آر پار گھل مل سکتی ہے۔۔۔ پرندے اڑان اِدھر سے بھرتے ہیں تو اترتے اُدھر ہیں۔ پر ایک لکیر کھنچی ہے۔ انسان ادھر بھی لکیر کے قیدی ہیں اور ادھر بھی لکیر کے اسیر ہیں۔ وہ بس گولیوں کی آواز سنتے ہیں۔ بارود کی بو سونگھتے ہیں۔ ان آوازوں میں ہنسی، موسیقی، سرگوشیاں سب کھو جاتی ہیں۔"(۱۸)

اس کالم میں مصنفہ نے دو گھرانوں مسلمان اور ہندوؤں کی شادی کا ذکر کیا ہے۔ مرکزی کردار زینب مسلمان ہیں اور راکھی ہندو۔ زینب اور راکھی شادی کے دن فائرنگ کے باعث گولیوں کا شکار ہو کر انتقال کر جاتی ہیں۔ مصنفہ نے اس معاشرے کی تصویر کشی کی ہے جہاں انسانیت پاؤں تلے کچل دی جاتی ہے اور مذہب کو بنیاد بنا کر قتل و غارت کی فضا قائم ہوتی ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں بے حسی عروج پر ہوتی ہے، جہاں انسانی جانیں مٹی کے ملبے تلے دبا دی جاتی ہیں اور ڈھولک کی تھاپ پر بین کرتی آوازیں انسانیت کے نوحے کی داستان سناتی ہیں۔

کالم **"بیٹی کی موت پر دو نفل شکرانے"** میں مصنفہ نے حقیقی عورتوں کے مسائل کو سامنے لایا ہے۔ مصنفہ ایک ایسے مرکزی کردار بچی کی کہانی اسی کی زبانی بیان کرتی ہیں جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ ایک ایسی بچی جو پیدا ہونے سے پہلے ہی ماں کے بطن میں باپ کے ہاتھوں قتل کر دی جاتی ہے۔ اس کالم میں ایک ایسے سفاک شراب کے نشے میں دھت باپ کی کہانی ہے جو ان تمام گھٹیا مردوں کی عکاسی کرتا ہے جو اپنی عیاشیوں میں مست عورت کے پیسوں پر پلنے والے درندے ہیں۔ ایسے درندے جو اپنی اولاد کو بھی قتل کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ مصنفہ نے ایسے سنگدل شوہر اور ظالم باپ کے ظلم و ستم کی داستان کو کرب انگیز کیفیت سے محسوس کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کی ان ہزاروں عورتوں کی عکاسی کی گئی ہے جو صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے اپنی ذات تک کی نفی کر دیتی ہیں۔ وہ عورتیں اپنے گھر کو بسانے کی خاطر شوہر کے ظلم اور سب و شتم کو برداشت کرنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی قسمت پر قانع ہو جاتی ہیں اور مزاحمت کا رویہ اختیار کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ ایسی عورت کی بے بسی اور مجبوری کو کالم میں موضوع بنایا گیا ہے جو اپنی ہی بیٹی کی موت پر شکرانے کے نفل ادا کرتی ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ جو زندگی وہ گزار رہی ہے وہ زندگی اس کی بیٹی گزارنے سے بچ گئی۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"نہ تو میرے قتل پر واویلا مچا، نہ ہی کورٹ کچہری کے چکر لگے۔ مجرم کو سنگین جرم کی سزا دینے کے بجائے اس کو بن مانگے معافی دے دی گئی۔

اماں نے مجھے چوما اور میری موت پر شکرانے کے دو نفل کی منت مانگی۔ اپنے رب کا شکر کیا کہ میں اس دُنیا میں نہیں آئی ورنہ ایک دن میں بھی نشے میں دھت انسان کی مار کھا کر بھی روح اور جسم کو زخمی کرنے والے کی مرہم پٹی کر رہی ہوتی۔"(۱۹)

کالم **"چنبیلی کی تلاش"** میں مصنفہ نے دل خراش حقیقی واقعے کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ مصنفہ نے اس کالم میں معاشرے کے نام نہاد شرفا کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو بھرے میلے میں لڑکیوں کی عزت کی نیلامی پر خاموش رہ کر ظالموں کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کالم کی مرکزی کردار شریفاں ہے جس کے جسم سے کپڑا نوچنے والے غلیظ درندوں کے کالے کرتوت عیاں کیے گئے ہیں۔ دو لڑکیوں کو اس جرم کی پاداش میں برہنہ کیا گیا کیوں کہ اس کے بھائی نے گاؤں کی لڑکی کو موبائل فون دینے کی غلطی کی تھی۔ شریفاں اور اس کی بہن ظلم و ستم برداشت کرتے ہوئے چنبیلی کو پکارتی ہیں وہ نواب پور کی عورت جس نے دو برہنہ جسموں پر چادر ڈال کر عزت دار شریف لوگوں کے منہ پر تمانچہ مارا تھا۔ مصنفہ اپنے کالم میں چنبیلی کو مسیحی عورت کہتی ہیں۔ مصنفہ نے چنبیلی کو مسیحی عورت کہہ کر کالم کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"دو ہاتھ زرد پتوں کی طرح جسم کے دو حصوں کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہے تھے اور مجمع ان پتوں کے گر جانے کے لیے کسی ہلکے سے جھونکے کا منتظر تھا اور شریفاں کی مضطرب نگاہیں چنبیلی کی متلاشی تھیں۔ اس کا دل کسی چنبیلی کو پکار رہا تھا۔ ارے وہی مسیحی عورت چنبیلی جس نے کئی برس پہلے نواب پور میں ایسے ہی قصے کا کردار بنے دو برہنہ جسموں پر چادر ڈالی تھی۔"(۲۰)

جمشید اقبال اپنے کالم "چنبیلی اور بچیاں اٹھانے والے بونے" میں ۱۹۸۰ء کی اس ہندو چنبیلی کا ذکر کرتے ہیں جس نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نواب پور میں مسلمان لڑکیوں کو پناہ دی تھی وہ لکھتے ہیں کہ:

"جب بھی کم عمر ہندو بچیوں کے اغوا' مذہب کی جبری تبدیلی اور اس کے خلاف بننے والے قانون کی مخالفت دیکھتا ہوں تو چنبیلی کی یاد آنے لگتی ہے۔ وہ ہمارے قصبے کے ہندو خاکروب کی بیوی تھی۔۔۔ وہ ان تین بچیوں کی چیخیں تھیں جن کے بھائی کو ان کی آنکھوں کے سامنے قتل کرنے کے بعد زمینداروں کا گروہ تقریباً دو میل تک برہنہ سڑکوں پر گھسیٹتا، پیٹتا اور ہانکتا آرہا تھا۔۔ جب ہوس کا بے بس بچیوں سے اجتماعی زیادتی کا اعلان کر رہے تھے اسی وقت چنبیلی کوٹھڑی سے باہر نکلی۔۔۔ وہ دو چادریں لے کر باہر آگئی' سڑک کے وسط میں ظالموں کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔۔ چنبیلی نے مظلوم مسلمان عورتوں کے تحفظ کے لئے اپنی جان داؤ پر لگائی تو ہم جیسوں کو نوعمری میں گیان ہو گیا کہ انسان دوست، نیک اور عظیم انسان پیدا کرنے کا ٹھیکہ کسی ایک مذہب کے پاس نہیں ہے۔"(۲۱)

اس کالم میں اہم پیغام یہ دیا گیا ہے کہ مذہب سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خاطر جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔

کالم **"تیس من گندم"** میں ایک سچا واقعہ مصنفہ نے افسانوی طرز میں بیان کیا ہے۔کالم کی مرکزی کردار اچھی آپا اور ننھی ہیں۔اچھی آپا کی عزت تار تار کر کے اسے گاؤں میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور جب جرگہ بیٹھتا ہے تو وڈیرا اس لڑکی کی عزت کے دام لگاتا ہے جو تیس من گندم ہے۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"مگر باپ کی غیرت یہ بات کہاں گوارا کرتی کہ اس کی بیٹی کی انمول عزت کے دام لگائے جائیں اور وہ بھی گندم کے دانوں کی صورت۔باپ کا سر انکار میں کیا ہلا قیامت آ گئی۔حکم عدولی کو بغاوت سمجھا گیا اور علاقہ بدری کا حکم جاری ہوا۔"(۲۲)

اس تحریر میں مصنفہ نے وڈیروں کے ظلم و ستم کو موضوع بنا کر حقیقی تانیثی مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔اس میں ایک ایسی گاؤں کی سرزمین کا ذکر ہے جہاں وڈیرے نہ صرف غریبوں کا خون چوستے ہیں بلکہ اپنے کارندوں کے ساتھ مل کر اپنے گٹر کی آگ بجھانے کے لیے غریبوں کی بیٹیوں کا استحصال بھی کرتے ہیں۔

کالم **"گینگ ریپ کی لوٹ سیل"** میں مصنفہ مذہبی علما کو بھی تنقید کا نشانہ بنانے سے گریز نہیں کرتیں جو عورتوں پر تشدد کی شرح کو بڑھانے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں اور خواتین کے حقوق سے متعلّق بل کی مخالفت کر کے اسے مغربی پروپیگنڈا قرار دیتے ہیں۔مصنفہ ایسے مذہب کے ٹھیکے دار علما کو نہ صرف کڑی تنقید کا نشانہ بناتی ہیں بلکہ عوام کے شعور کو بیدار کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ انھوں نے اس کالم میں **تیس من گندم** کے واقعے کے متعلق انکشاف کیا کہ عمر کوٹ میں گینگ ریپ کا واقعہ پیش آیا تھا۔مصنفہ جہاں حقائق کو پیش کرتی ہیں وہاں جذبات و احساسات کے ذریعے لڑکی پر ہونے والے ظلم و ستم کو محسوس کرتی ہیں۔جس سے ان کی روح تک چھلنی ہو جاتی ہے۔

دی ایکسپریس ٹری بیون میں لکھا گیا کہ بچی کے والد سلیمان شیخ کا کہنا تھا کہ عمر کوٹ میں جرگے نے ۳۰ کلو گندم اور قرض معافی کے بدلے زیادتی کے مقدمے کو دبانے کی کوشش کی، جسے متاثرہ خاندان نے مسترد کر دیا۔

زیڈ علی / سرفراز میمن واقعے سے متعلق لکھتے ہیں کہ

Members of a Jirga in Sindh's Umerkot district tried to settle a rape case last week by offering " to waive off the debt run up by the victim's father and doling out 30 kilograms of wheat.

اصل واقعہ جو اخبارات میں رپورٹ ہوا اس میں اصل حقائق مصلحت پسندی کی نظر ہو گئے اور جرگے سے متعلق کہا گیا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

"Police and concerned members of the Rajar community have denied holding any such ۲۴gathering while *R's family is also reluctant to divulge any details."

مقامی صحافیوں کے مطابق، جرگے کی قیادت ایک بااثر سیاسی شخصیت نے سنبھالی اور انصاف کے بدلے رقم معاف کرنے کی پیشکش کی، جو نہ صرف قانون بلکہ انسانی وقار کی صریح توہین ہے۔ اگرچہ پولیس اور بعض حلقے اس جرگے کے وجود سے انکار کرتے ہیں، یہ انکار خود اس جبر و ظلم کے نظام پر ایک کھلا سوالیہ نشان ہے۔ اخبارات میں رپورٹ ہونے والے واقعات سطحی نوعیت کے ہوتے ہیں جن میں جذبات کو عمل دخل نہیں ہوتا۔ حقائق کو جذبات کی سطح سے ہٹا کر واقعاتی نوعیت کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مصنفہ اپنے کالم میں واقعات کو جذباتیت کے پیش نظر بیان کرتی ہیں۔

کالم **"عورت حلال اور تشدد جائز"** میں عورتوں پر ہونے والے ظلم و ستم کی انتہاؤں کا تذکرہ موجود ہے۔ ان ظلم و ستم کو معمولی سمجھا جاتا ہے۔ مصنفہ نے ظلوم و جہول کی سبک سری کو اپنی تحریر کے ذریعے سامنے لایا ہے۔ اس کالم میں وہ بڑے بڑے مذہبی علما پر کڑی تنقید کرتی ہیں جو حقوق نسواں کے بل کی مخالفت کرتے ہیں اور نہ صرف تشدد کو معمول کا واقعہ سمجھتے ہیں بلکہ عورت کو زر خرید غلام بھی سمجھتے ہیں جن کو ہانکنا مرد کا فرض ہے۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"پینتیس جماعتوں کے علما نے بل کی مخالفت کے لیے اجلاس میں عورت کی شمولیت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ عورت تو ہوتی ہی ناقص العقل ہے، وہ کیا جانے اس کے حقوق کی حفاظت کس طریقے سے کی جانی چاہیے۔ یہ سب کے سب مغرب کے ہتھکنڈے ہیں جو ہمارے خاندانی نظام کو درہم برہم کرنے کے درپے ہیں۔"(۲۵)

اس کالم میں اس حقیقت کو بھی سامنے لایا گیا ہے کہ متاثرہ خواتین کے لیے ملک میں کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ اگر قانون حرکت میں آ بھی جائے تو خواتین کو سسکتے سسکتے اپنی زندگی گزار دینے کی ترغیب دی جاتی ہے جہاں وہ صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنی جان کی بازی ہار جاتی ہیں۔ مصنفہ تہذیبی جمود میں دراڑ ڈال دیتی ہیں اور عورتوں کے حقوق کے متعلق اپنی تحریروں میں لکھنے کی جسارت رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کی مظلومیت دراصل پورے سماجی نظام کی بے حسی کا عکس ہے جہاں ظلم کو معمول سمجھ کر رواں رکھا جاتا ہے۔

کالم **"پیڑ پر بنا دل دھڑکتا تو ہوگا"** میں مصنفہ نے گلزار صاحب کے افسانے "جامن کے پیڑ" سے اقتباس لیا ہے جس میں مرکزی کردار دینا کی لاش کو جامن کے پیڑ کی ٹہنیوں سے آگ لگا دی جاتی ہے۔ اس میں ان لوگوں پر طنز ہے جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہجوم کو مشتعل کرتے، قتل و غارت گری کی فضا پیدا کرتے اور مذہبی منافرت کو فروغ دیتے ہیں۔

گلزار کے افسانے "جامن کا پیڑ" کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"گھروں میں لوٹ مار شروع ہو گئی۔دینا کی لاش جامن کے نیچے پھینک دی گئی۔ایک نے کہا،"یہ مسلمان ہے۔"دوسرے نے کہا"اسے جلادو تاکہ سیدھا نرک میں جائے۔"تیسرے نے جامن کی ٹہنیاں کاٹ کر اس پر ڈالنا شروع کر دیں۔"(۲۶)

مصنفہ اس افسانے کے اقتباس پر کالم لکھ کر ایک طرف معاشرے پر طنز کرتی ہیں تو دوسری طرف اپنے متعلق ہراسانی کا اظہار کرتی ہیں کہ خدانخواستہ کسی دن وہ بھی مذہبی منافرت کا شکار نہ ہو جائیں۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"سوچتی ہوں کہ جس طرح گلزار کے پیڑ کا دل ٹوٹ گیا تھا، کیا میرے پیڑ پر بنا دل بھی ایک دن دھڑکنا بھول جائے گا؟"(۲۷)

کالم **"کیا طوائف کا دل بھی دھڑکتا ہوگا؟"** میں طوائف کے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کو مصنفہ نے صفحہ قرطاس پر رقم کیا ہے۔ایک ایسی داستان جہاں طوائفیں چہرے پر مردہ مسکراہٹ سجائے ہر روز کربناک اذیت سے گزرتی ہیں۔مصنفہ ناصرف ان کے صعوبتوں کو بیان کرتی ہیں بلکہ یہ پیش گوئی بھی کرتی ہیں کہ طوائفوں کا دل نہیں دھڑکتا۔ان کا کہنا ہے کہ اپنے گھروں میں عزت دار زندگی گزارنے والی عورتیں ہی دل رکھتی ہیں۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"یہ جن کا تذکرہ ہے، انھیں کسبی کہہ لیجے، جسم فروش کہہ لیجیے، طوائف کہہ لیجیے۔ان کی زندگی میں دُکھ ہیں۔ہوس ناک نظریں ہیں۔بدن کے سودے ہیں۔مردہ سیجیں ہیں۔پر وہ لمحے کہاں ہیں جو دل دھڑکاتے ہیں؟ مجھے لگتا ہے کہ کبھی کسی طوائف کے سینے پر کان رکھ کر کوئی سنے تو صرف خاموشی ملے گی۔"(۲۸)

کالم **"طلاق کا اطلاق"** میں معاشرے کی حقیقت کو عیاں کیا گیا ہے۔معاشرے میں دیکھا جائے تو مرد اپنی مظلوم بیوی کا ساتھ دینے کی بجائے بدنامی سے بچنے کی خاطر عورت کو طلاق دینے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔وہ اپنی ہی بیوی کے ماتھے پر طلاق کا دھبہ لگانے سے گریز نہیں کرتے۔

حقوق نسواں کے حوالے سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ایمان میں سب سے کامل مومن وہ ہے جو سب سے بہتر اخلاق والا ہو اور تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اخلاق میں اپنی عورتوں کے حق میں سب سے بہتر ہو۔"(۲۹)

اس کالم میں ایسے مردوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے جو اپنی بیویوں سے حسن سلوک کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے انھیں مزید تکالیف میں مبتلا کرتے ہیں۔اس کالم کی مرکزی کردار ایک ایسی عورت ہے جو گینگ ریپ کا شکار بنتی ہے۔

اپنے شوہر کو مضبوط سہارا سمجھتے ہوئے اسے فون پر ساری حقیقت بتاتی ہے لیکن اس کا شوہر اس کا ساتھ دینے کی بجائے اپنے بچوں کی پرواہ بھی نہیں کرتا اور اسے طلاق دے دیتا ہے۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"یہ حوّا کی بیٹی جو امید، آس اور ہمدردی کی دنیا بنائے بیٹھی تھی ان طلاق کے لفظوں نے اس دنیا کو یک لخت زمین بوس کر دیا ہوگا۔ شوہر صاحب نے یہ سوچا ہوگا کہ کون بدنامی کے ڈھول کو گلے میں باندھے،۔۔۔"(۳۰)

المختصر یہ کہ دھنک کا آٹھواں رنگ لینہ حاشر کی ایسی نثری کائنات ہے جہاں عورت کی بے بسی محض بیان نہیں ہوتی بلکہ ایک زندہ تجربہ بن کر قاری کے احساس میں اترتی ہے۔ اس کتاب میں پیش کیے گئے کالم حقیقی واقعات کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں، مگر افسانوی نثر کی صورت اختیار کر کے مصنفہ خبر یا رپورٹ کو الم ناک کہانیوں کی صورت میں سامنے لا کر سماجی بیداری کے حوالے سے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مصنفہ کا قلم قاری کو الزام دینے کی بجائے خود احتسابی کے عمل کی جانب لے جاتا ہے، اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی ادبی و فکری قوت ہے۔ لینہ حاشر کا اسلوب شستہ اور ذہن تہذیبی شعور سے لبریز ہے۔ وہ مثالوں، واقعات اور روزمرہ کے سانحات کو ادبی جمالیات کے ساتھ یوں جوڑتی ہیں کہ تحریر محض کالم نہیں رہتی بلکہ عہدِ حاضر کی سماجی دستاویز بن جاتی ہے۔

حوالہ جات:

1. Dr Hina Jamshed, Dhanak Ka Aathvaan Rung by Leena Hashir (review), time duration 0.01-0.15, 2 Years ago, https://youtu.be/zsQfxN-EhVM?si=eTJPCrbc2MrVrd5p

۲۔(القرآن،۴۲:۵۰-۴۹)

۳۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، (جہلم: بک کارنر، اشاعت دوم فروری ۲۰۲۳ء)، ص۳۹۔۴۰

4. Ali Akbar, "Transgender Alisha succumbs to wounds at Peshawar hospital", Dawn, Published May 25, 2016, Accessed January 05, 2026, http://www.dawn.com/news/1260559

THE EXPRESS TRIBUNE, Published ',gol roti'5. Outrage: Father killed daughter for not making September 30, 2015, Accessed January 05, 2026, https://share.google/EvnHw2dDuG3k8AIXG

۶۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، (جہلم: بک کارنر، اشاعت دوم فروری ۲۰۲۳ء)، ص۵۹

)القرآن،۵۸:۱۶)(۷۔

۸۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، (جہلم: بک کارنر، اشاعت دوم فروری ۲۰۲۳ء)، ص۷۳

۹۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص۷۳

۱۰۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص۹۴

۱۱۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۹۵

۱۲۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۹۸

۱۳۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۹۹

۱۴۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۱۱۸

15. Leena Hashir, Twitter spaces with Hum sub: Leena Hashir's Book Dhanak Ka Aathvan Rang, Time duration 1:26:46-1:27:14, 2 Years ago, https://youtu.be/BtOLuPx5mig?si=Q4yIw7ZWr9slqjj6

16. Syed Ali Shah," Four Hazara women killed as gunmen open fire on Quetta bus, DAWN E-PAPER, Published October 4, 2016, Accessed January 05, 2026, http://www.dawn.com/news/1287981

۱۷۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، (جہلم: بک کارنر، اشاعت دوم فروری ۲۰۲۳ء)، ص ۱۲۳

۱۸۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۱۳۲

۱۹۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۱۴۱

۲۰۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۱۵۶

۲۱۔جمشید اقبال،"چنبیلی اور بچیاں اٹھانے والے بونے"،ہم سب، ۳۰ دسمبر ۲۰۱۶ء، https://share.google/Ly3lzQpwOtokQ5OHM

۲۲۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، (جہلم: بک کارنر، اشاعت دوم فروری ۲۰۲۳ء)، ص ۱۶۷

23. Z Ali/Sarfaraz Memon, "Jirga offers to pay debt of rape victim's father", THE EXPRESS TRIBUNE, Published April 02, 2016, Accessed January 05, 2026, https://tribune.com.pk/story/1077880/unusual-settlement-jirga-offers-to-pay-debt-of-rape-victims-father

24. Z Ali/Sarfaraz Memon, "Jirga offers to pay debt of rape victim's father", THE EXPRESS TRIBUNE, Published April 02, 2016, Accessed January 05, 2026, https://tribune.com.pk/story/1077880/unusual-settlement-jirga-offers-to-pay-debt-of-rape-victims-father

۲۵۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، (جہلم: بک کارنر، اشاعت دوم فروری ۲۰۲۳ء)، ص ۱۷۲۔۱۷۳

۲۶۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۱۸۵

۲۷۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۱۸۸

۲۸۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، ص ۱۹۲

۲۹۔حدیث نبوی ﷺ، منقول سنن ترمذی (اردو مترجم)، حدیث نمبر ۱۱۶۲

۳۰۔لینہ حاشر، دھنک کا آٹھواں رنگ، (جہلم: بک کارنر، اشاعت دوم فروری ۲۰۲۳ء)، ص ۲۴۶